Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

JOURNAL PROFILE
Noor-e-Tahqeeq is a quarterly, HEC "Y" Category research journal of Lahore Garrison University, publishing peer-reviewed studies in Urdu language and literature since 2017. It provides a credible platform for original research and contemporary criticism.

CONTACT
Dr Muhammad Haroon Qadir
Editor, Noor e Tahqeeq
Department of Urdu
Lahore Garrison University, Lahore, 0303-3330345

Email
lgunt@lgu.edu.pk

Website
https://ojs.lgu.edu.pk/nooretahqeeq

ISSUE DETAILS
Volume 9, No 03
July to September 2025
Page No: 15-27

DOI
https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2025.09032366

HISTORY OF THE PAPER
Received on: June 21, 2025
Accepted on: July 10, 2025
Published on: Aug 19, 2025

PUBLISHED BY
Department of Urdu,
Lahore Garrison University
DHA Phase 6, Sector C,
Avenue 4, Lahore

TITLE OF THE PAPER

Miraji's poem "The Sequence of Day and Night": An analytical study of an existential, unconscious, and internal conflict

میراجی کی نظم "سلسلۂ روز و شب": ایک وجودی، لاشعوری اور داخلی کشمکش کا تجزیاتی مطالعہ

AUTHOR(S)

- **Dr Assad Mehmood Khan**
  Associate Professor, Head of Urdu Department
  Minhaj University, Lahore
- **Dr Hafiz Ghulam Murtaza**
  Lecturer, Department of Urdu
  Lahore Leads University, Lahore

ABSTRUCT

This paper explores the intricate interplay of existential anxiety, unconscious impulses, and internal conflict in Meera Ji's poem "Silsila-e-Roz-o-Shab". Moving beyond romantic or purely aesthetic readings, the study situates Meera Ji within a broader intellectual and philosophical context, analyzing how his poetic expression becomes a site of ontological and psychological inquiry. The poem reflects a fractured self-navigating universe marked by void, uncertainty, and metaphysical disorientation. Using symbolic imagery, such as fire, mirrors, and emptiness؛ Meera Ji conveys the fragmentation of identity and the struggle to grasp truth in a reality governed by illusions. This paper applies existential and psychoanalytic frameworks to examine how the poem dramatizes the loss of meaning, the unreliability of perception, and the haunting presence of the unconscious. Ultimately, Meera Ji's voice emerges not as a seeker of certainty, but as a witness to the human condition's most unsettling enigmas.

KEY WORDS

Existentialism, Unconscious, Inner Conflict, Symbolism, Modern Urdu Poetry, Ontological Anxiety

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

میراجی کی نظم "سلسلۂ روز و شب": ایک وجودی، لاشعوری اور داخلی کشمکش کا تجزیاتی مطالعہ

وجودی، لاشعوری اور داخلی کشمکش وہ بنیادی جہات ہیں جو انسان کی ذات، شعور اور باطن کے پیچیدہ رشتوں کو نمایاں کرتی ہیں۔ وجودی سوچ اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ انسان ایک آزاد، مگر تنہا اور ناپائیدار ہستی ہے، جو اس وسیع اور بے مایہ کائنات میں اپنے وجود، مقصد اور معنویت کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ یہ تلاش اسے داخلی سطح پر ایک ایسی کشمکش میں مبتلا کر دیتی ہے، جہاں سوالات کے تسلسل میں یقین، اختیار اور ذمہ داری جیسے تصورات الجھ جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ لاشعور کا وہ دبیز پردہ بھی ہے، جس میں دبی ہوئی خواہشات، انجانے خوف، ناتمام تجربات اور غیر واضح جذبات چھپے ہوتے ہیں۔ انسان کی داخلی کشمکش دراصل انہی دونوں جہتوں؛ اس کے شعوری اضطراب اور لاشعوری بے چینی؛ کا امتزاج ہے، جو اسے نہ صرف فکری طور پر جھنجھوڑتا ہے بلکہ روحانی اور جذباتی سطح پر بھی ایک مسلسل بے قراری سے دوچار رکھتا ہے۔

انسانی تجربہ محض ظاہری افعال و اعمال تک محدود نہیں، بلکہ اس کا اصل جوہر اس کی باطنی کیفیتوں، ذہنی پیچیدگیوں اور وجودی سوالات میں پوشیدہ ہے۔ فرد، اس وسیع اور خاموش کائنات میں، ایک ایسے مسافر کی مانند ہے جو نہ صرف بیرونی دنیا سے نبرد آزما ہوتا ہے بلکہ اپنے اندر کے سوالات، خوف، خواہشات اور تنہائی سے بھی مسلسل مکالمے کی حالت میں رہتا ہے۔ یہی داخلی مکالمہ اس کی زندگی کو بامعنی بناتا ہے، یا پھر اُسے ایک بے یقینی اور الجھن سے بھرے خلا میں دھکیل دیتا ہے۔ یہ کیفیت جسے ہم وجودی کشمکش کہتے ہیں، دراصل اس لمحے کی پیداوار ہے جب انسان اپنی ذات کی معنویت، اپنی آزادی اور اس کے بوجھ، اپنی مختاری اور اس کے انجام کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ یہ وجودی اضطراب انسان کو داخلی سطح پر ایک ایسی کشمکش میں مبتلا کر دیتا ہے جو صرف شعوری سطح تک محدود نہیں رہتی بلکہ لاشعور کی تاریک پرتوں میں بھی سرایت کر جاتی ہے۔ لاشعور، ایک ایسی گہرائی ہے جہاں دبی ہوئی خواہشات، انجانے خوف، ناتمام تجربات اور ماضی کی گونج محفوظ رہتی ہے۔ انسان جب اپنی بیرونی زندگی کے دباؤ سے تھک کر اندر کی طرف جھانکتا ہے تو وہ اپنے ہی ذہن کے ان گوشوں سے روبرو ہوتا ہے جن سے وہ عام طور پر غافل یا لاعلم رہتا ہے۔ یہی لاادراکی عناصر اس کی داخلی کشمکش کو جنم دیتے ہیں؛ وہ کشمکش جو ظاہر اور باطن، شعور اور لاشعور، چاہت اور ذمہ داری، امید اور خوف کے درمیان پلتی رہتی ہے۔

ادب اور بالخصوص نظم، ان نادیدہ باطنی کیفیات کو اظہار کا وہ پُراثر ذریعہ فراہم کرتی ہے جس کے ذریعے فرد اپنے اندر کے سوالات، تضادات اور تشنگیوں کو کسی معنوی سانچے میں ڈھالنے کی سعی کرتا ہے۔ نظم کا وہ "میں" جو بظاہر ایک ذاتی اظہار ہے، دراصل ایک ایسی داخلی آواز بن جاتی ہے جو اجتماعی لاشعور اور وجودی احساسات کو بھی اپنے اندر سمو لیتی

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید اردو نظم میں، بالخصوص میراجی جیسے تخلیق کاروں کے ہاں، یہ تینوں جہات ؛وجود، لاشعور اور داخلی کشمکش ؛ایک گہرے فکری اور تخلیقی وحدت کے ساتھ ابھرتی ہیں۔ ان کا شعری کلام محض الفاظ کا امتزاج نہیں بلکہ ایک فکری مکالمہ ہے، جس میں انسان اپنی گمشدہ معنویت کو تلاش کرنے کی سعی کرتا ہے۔یہی وہ فکری زمیں ہے جہاں میراجی جیسے شعرا کی تخلیقات خاص اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ذات، وقت، تنہائی، خواب، لاشعور اور وجود کی پیچیدہ گتھیاں ایک ایسی شعری زبان میں ڈھلتی ہیں جو نہ صرف قاری کو متاثر کرتی ہے بلکہ اسے اس کی اپنی اندرونی دنیا کی طرف متوجہ بھی کرتی ہے۔یوں وجودی، لاشعوری اور داخلی کشمکش صرف ایک فکری مباحثہ نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی تخلیقی حقیقت بن جاتی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا "نظم اور اس کا پس منظر" میں رقم طراز ہیں:

> "نظم دراصل شاعری کی ایک اہم صنف ہے اور اس کی فہم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم شعر کی جامع تعریف، اس کی تخلیقی حدود اور اس کے فکری و جمالیاتی اثرات کا گہرا جائزہ نہ لے لیں۔ جب تک شعر کی ماہیت اور اس کے داخلی و خارجی پہلوؤں کو واضح نہ کیا جائے، نظم کے خدوخال اور اس کے فنی و فکری مزاج کا تعین بھی دشوار رہتا ہے۔"(۱)

جدید نظم اردو ادب میں ایک ایسی شعری صنف کے طور پر ابھری جو نہ صرف فنی ساخت اور عروضی اصولوں سے انحراف کی علامت بنی بلکہ اس نے اظہار کے نئے زاویے، داخلی کیفیات اور فرد کے پیچیدہ تجربات کو اپنی جمالیاتی بنیاد بنایا۔ بیسویں صدی میں جب فرد معاشرتی، فکری اور نفسیاتی سطح پر بحران کا شکار ہوا، تو جدید نظم نے اس بحران کو ایک تخلیقی موقع میں ڈھال کر ادب کو نئے معنوی ابعاد سے آشنا کیا۔ اس تحریک میں میراجی کا کردار نہایت اہم اور منفرد ہے۔ میراجی کو صرف ایک اسلوبی تجدید کار کے طور پر دیکھنا ان کے تخلیقی جوہر کی توہین ہو گی، کیوں کہ ان کی نظم نگاری نہ صرف موضوعاتی گہرائی رکھتی ہے بلکہ اس میں داخلی کشمکش، جنسی لاشعور، خواب و خیال کی کیفیات اور وجودی اضطراب کی پیچیدگی بھی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ میراجی نے اردو نظم کو اس کی سطحی جذباتیت سے نکال کر ایک فکری اور نفسیاتی جہت عطا کی، جہاں فرد محض ایک مظلوم یا عاشق نہیں بلکہ ایک باطنی سوالات میں گھرا، متذبذب اور شعور و لاشعور کے بیچ جھولتا ہوا انسان ہے۔ ان کی نظموں میں علامتوں، استعاروں اور صوتی پیکروں کے ذریعے ایک ایسی شعری دنیا تشکیل پاتی ہے جو قاری کو محض جمالی لذت نہیں دیتی بلکہ فکری بیداری، نفسیاتی مکاشفہ اور وجودی جستجو کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے۔ میراجی کی نظم دراصل جدید اردو نظم کی وہ آواز ہے جو خاموشی میں بھی ارتعاش پیدا کرتی ہے اور ذات کے گہرے سناٹوں کو لفظوں کی سطح پر محسوس کروا دیتی ہے۔ نظم کے ارتقائی منظر نامے کو بیان کرتے ہوئے کوثر مظہری لکھتے ہیں:

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

"جدید نظم نگاری کی بنیاد اگرچہ آزاد اور حالی جیسے ابتدائی مفکرین وشاعروں کے دور میں رکھ دی گئی تھی، تاہم یہ محض ایک ادبی تحریک کے طور پر نہیں، بلکہ ایک فکری اور جمالیاتی رویے کے طور پر پروان چڑھی۔ رفتہ رفتہ اس تحریک نے اپنے اسلوب، موضوعات اور داخلی ساخت میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں، جنہوں نے اردو شاعری کو ایک نئی سمت عطا کی۔"(۲)

وجودی فکر (Existential Thought) کا بنیادی محور فرد کی داخلی آزادی، انتخاب اور بے معنویت کی آگہی ہے؛ ایک ایسی فکری زمین جہاں انسان خود کو کائناتی وسعتوں میں تنہا، مضطرب اور بے سہارا محسوس کرتا ہے اور پھر اس تنہائی میں اپنے وجود کا مفہوم خود تراشتا ہے۔ میراجی کی شاعری خصوصاً ان کی آزاد نظم نگاری اسی وجودی شعور کی عکاس ہے، جہاں فرد ایک سوال بن کر سامنے آتا ہے؛ ایسا سوال جو خود اپنی تلاش میں مبتلا ہے۔ میراجی کے ہاں "میں" (self) کوئی ساکت وجامد وحدت نہیں بلکہ ایک مسلسل بدلتا ہوا شعور ہے، جو لاشعور کی گہرائیوں سے ابھرتی ہوئی صداؤں، خوابوں اور جذبوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ ان کی نظموں میں وجود کی وہ گمشدگی بھی ہے جو کائنات کی بے معنویت میں فرد کو لاحق ہوتی ہے اور وہ جستجو بھی، جو اس بے معنویت کو معنی میں بدلنے کی آرزو سے جنم لیتی ہے۔ یہی تضاد؛ یعنی اضطراب اور تلاش، بے یقینی اور جستجو؛ میراجی کے شعری وجود کو ایک خاص فکری گہرائی عطا کرتا ہے۔ ان کی نظم "سلسلۂ روز و شب" اس امر کی خوب صورت مثال ہے، جہاں تخیل، خلا اور وقت جیسے مجرد تصورات کو داخلی کیفیات سے ہم آہنگ کر کے ایک وجودی بصیرت میں ڈھالا گیا ہے۔ میراجی کا فن صرف الفاظ کی ترتیب نہیں، بلکہ ایک فکری اظہار ہے؛ ایک داخلی مکالمہ، جو فرد کو خود اپنے سوالات سے روبرو کرتا ہے۔ اس طرح میراجی کا شعری آہنگ وجودی فکر کے اس تخلیقی دائرے سے جڑا ہوا ہے، جو فرد کو "کیا ہوں؟"، "کیوں ہوں؟" اور "کہاں جا رہا ہوں؟" جیسے سوالات کے گہرے سمندر میں دھکیل دیتا ہے۔ کیرکیگارڈ لکھتی ہے:

"اضطراب دراصل وجودی آگہی (Existential Awareness) کا وہ ابتدائی لمحہ ہے جہاں فرد نہ صرف اپنی تنہائی اور انتخاب کی بھاری ذمے داری کو محسوس کرتا ہے، بلکہ خود اپنی شخصیت کی تخلیق اور تشکل کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر محسوس کرتا ہے۔ یہی کیفیت اسے ایک باشعور، بااختیار اور جُہدِ مسلسل میں مصروف انسان بناتی ہے۔"(۳)

انسانی وجود کی فکری تشکیل میں ایک مرکزی نکتہ یہ ہے کہ انسان محض ایک حیاتیاتی حقیقت نہیں بلکہ ایک معنوی اور تخلیقی شعور بھی ہے۔ وہ اپنی ذات کا خالق ہے، جو نہ صرف اپنے باطن کی شناخت حاصل کرتا ہے بلکہ اس شناخت کی بنیاد پر اپنی انفرادیت کو بھی سنوارتا ہے۔ اس عمل میں فرد کسی بیرونی سہارے یا موروثی اقدار پر انحصار نہیں کرتا بلکہ اپنی داخلی

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

صداقت اور فطری میلان کو رہنما بناتا ہے۔ یہی فکری رجحان اسے ایک تخلیقی فنکار بناتا ہے، جو اپنے وجود کا مجسمہ خود تراشتا ہے۔ اس تخلیق میں نہ صرف آزادی شامل ہے بلکہ ذمہ داری بھی—یعنی فرد کو اپنے انتخاب، اقدار اور معنویت کا خود ضامن بننا پڑتا ہے۔ یہی مقام وہ ہے جہاں انسان کے اندر وجودی شعور بیدار ہوتا ہے اور وہ زندگی کو ایک بااختیار اور بامعنی عمل کے طور پر دیکھنے لگتا ہے۔ اس تناظر میں انسانی ہستی جامد نہیں بلکہ ایک مسلسل متحرک، ارتقائی اور معنویت کے متلاشی وجود کے طور پر نمایاں ہوتی ہے، نطشے کے مطابق:

"اپنے باطن کی شناخت حاصل کرو، اپنی انفرادیت کی تشکیل خود کرو اور وہ بنو جو تمہاری فطری ماہیت سے ہم آہنگ ہو۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے وجود کا مجسمہ ساز بنے اور اپنی ذات کو ایک تخلیقی شعور کے تحت سنوارے۔"(۴)

ساترے لکھتا ہے:

"وجودیت کا اولین اصول یہ ہے کہ انسان کا وجود اس کی فطری تعریف سے مقدم ہے؛ وہ پہلے دنیا میں آتا ہے، حالات سے نبرد آزما ہوتا ہے اور پھر اپنی ذات، مقصد اور اقدار کی تخلیق خود کرتا ہے۔ وہی کچھ بنتا ہے جو وہ اپنے شعوری انتخاب سے اپنے لیے چنتا ہے۔"(۵)

جدید اردو نظم کے تناظر میں میراجی کو محض ایک فنی یا تکنیکی تجدید کار کے طور پر محدود کر دینا اُن کی شعری فکر، اسلوبی تنوع اور وجودی معنویت کے ساتھ ایک بڑی علمی زیادتی کے مترادف ہوگا۔ میراجی کی نظم نگاری محض عروضی تجربات، امیجری کی جدت یا اسلوبی انفرادیت تک محدود نہیں، بلکہ وہ نظم کو ایک فکری، نفسیاتی اور روحانی مکاشفے کی صورت میں برتتے ہیں۔ ان کی شاعری میں فرد کی داخلی کشمکش، روحانی اضطراب اور انفرادی شعور کی تلاش کو نہایت تخلیقی انداز میں نظم کے قالب میں سمویا گیا ہے، جس سے نظم کا دائرۂ اظہار صرف جمالیاتی سطح پر نہیں بلکہ فکری اور وجودی جہتوں میں بھی وسعت اختیار کرتا ہے۔ میراجی کی نظموں میں جو خواب ناک کیفیت، علامتی فضا اور وقت کے شعور کی پیچیدگی موجود ہے، وہ قاری کو محض متاثر نہیں کرتی بلکہ اس کے باطن میں ایک فکری بیداری اور معنوی تلاطم کو جنم دیتی ہے۔ وہ نظم کو ایک ایسے بیانیے میں تبدیل کرتے ہیں جو محض جذباتی یا تاثراتی نہیں، بلکہ فکری تجزیے اور باطنی جستجو کا ایک مربوط حوالہ بن جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں انفرادیت، خاموشی، نفسیاتی اضطراب اور وجودی تنہائی جیسے عناصر اس انداز میں نظم کا حصہ بنتے ہیں کہ وہ اردو نظم کو ایک نئے فکری افق سے روشناس کراتے ہیں۔ میراجی کا شعری منصب کسی مخصوص دبستان یا تحریک تک محدود نہیں؛ بلکہ وہ جدید نظم میں ایک ایسی فکری ہمہ گیری پیدا کرتے ہیں جو انسانی شعور، لاشعور اور وجود کے مابین جاری مکالمے کو شعری سطح پر نمایاں کرتی ہے۔ ان کی نظم گوئی اردو شاعری کو محض اظہار کا وسیلہ نہیں بناتی، بلکہ ایک

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

فکری تجربہ، روحانی جستجو اور نفسیاتی خود شناسی کا جمالیاتی اظہار بھی فراہم کرتی ہے۔اسی تناظر میں، میرا جی(۶) کی نظم "سلسلۂ روز و شب" ایک فکری و شعری تجربے کا نمائندہ مظہر ہے، جو وجودی بے معنویت، لاشعوری اضطراب اور داخلی تنہائی جیسے موضوعات کو نہایت گہرائی سے پیش کرتی ہے۔ زیر نظر مطالعہ اسی نظم کے نفسیاتی اور وجودی پہلوؤں کی تفہیم کی ایک سنجیدہ کوشش ہے، جس کے ذریعے نہ صرف میرا جی کی شعری فکر کے اہم گوشے سامنے آتے ہیں، بلکہ جدید اردو نظم کی فکری و تخلیقی تاریخ کے ایک اہم باب کی تفہیم بھی ممکن ہوتی ہے۔

(۳)

میرا جی کی نظم گوئی دراصل اس باطنی سفر کی جمالیاتی تشکیل ہے، جو فرد اپنے شعور، لاشعور اور خارجی دنیا کے درمیان ایک مسلسل مکالمے میں طے کرتا ہے۔ ان کی نظموں میں پائے جانے والا سکوت، داخلی کشمکش اور خوابیدہ سی فضا کسی مخصوص علامتی یا شعری تکنیک کا محض حصہ نہیں، بلکہ اس روحانی تشنگی کا اظہار یہ ہے جو انسان کو اپنے وجود کی معنویت کی تلاش پر آمادہ کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں جو "میں" (Self) بولتی ہے، وہ ایک سماجی یا نفسیاتی شناخت سے زیادہ ایک وجودی شعور کا آئینہ بن جاتی ہے، جو مسلسل سوال کرتی ہے، مکالمہ کرتی ہے اور کسی یقینی مرکز کی غیر موجودگی میں بھی اپنی معنویت کی تشکیل پر مُصر رہتی ہے۔ وجودیت کے نمائندہ تصورات جیسے آزادی، اختیار، اضطراب اور بے معنویت؛ میرا جی کی نظموں میں محض فکری سطح پر نہیں بلکہ ایک تخلیقی کیفیت اور داخلی تجربے کے طور پر موجود ہیں۔ وہ نہ صرف اس اضطراب کو محسوس کرتے ہیں بلکہ اس کو ایک جمالیاتی تجربے میں ڈھال کر قاری کو بھی اس میں شریک کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کا قاری محض پڑھنے والا نہیں، بلکہ ایک متفکر ہمسفر بن جاتا ہے جو نظم کے اندر موجود علامتی اشارات اور فکری ابہام کے ذریعے اپنی داخلی کائنات سے روبرو ہونے پر مجبور ہوتا ہے۔ میرا جی کی شاعری اس امر کی شاہد ہے کہ اردو نظم میں وجودی فکر کو محض مروجہ موضوعات سے الگ کوئی تجریدی سلسلہ نہیں، بلکہ ایک زندہ، محسوساتی اور کرب انگیز حقیقت کے طور پر برتا جا سکتا ہے۔ اُن کا اسلوب، امیجری اور شعری لہجہ، سب مل کر ایک ایسی داخلی دنیا تشکیل دیتے ہیں جہاں ہستی اور نیستی، سوال اور خاموشی، جستجو اور بے یقینی؛ سب ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح میرا جی کی نظم گوئی اردو شاعری میں وجودی شعور کی ایک ندرت آمیز، باطنی اور فکری سطح پر گہری نمائندگی بن کر ابھرتی ہے۔

تھامس آر فلائن رقم طراز ہے:

"ادب ایک ایسی تخلیقی فضا میں ڈھل جاتا ہے جو وجودی اضطراب کے مقابل فرد کے لیے پناہ گاہ کا درجہ رکھتی ہے؛ ایک ایسا داخلی میدان، جہاں انسان زندگی کی بے معنویت، آزادی کے اندر

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

پوشیدہ کرب اور انتخاب کے بوجھ جیسے پیچیدہ تجربات کو زبان، استعارے اور بیانیے کے وسیلے سے معنویت عطا کرنے کی کوشش کرتا ہے تا کہ وہ ان کی تفہیم اور اظہار ممکن بنا سکے۔"(7)

ان کی شاعری کو محض جدید نظم کے فنی انحراف، عروضی تجربے، یا آزاد اسلوب کے مظاہر میں محدود کر دینا دراصل اس شعری کائنات کی معنوی گہرائی کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے جسے انھوں نے فرد کی تنہائی، اضطراب اور باطنی مکالمے کے ذریعے دریافت کیا۔ نظم "سلسلۂ روز و شب" صرف ایک شخصی تجربے کا بیان نہیں بلکہ اردو نظم کی فکری ارتقا کا وہ مرحلہ ہے جہاں شاعری اور فلسفہ ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔

ارتضٰی کریم لکھتے ہیں:

"اردو ادب میں مزاحمت اور احتجاج کے رویے یا اس کی صورت حال یا اس کے طریقۂ کار یا اس کی لے- آپ جس طرح بھی کہیں، اس کا مفہوم بہت واضح ہے۔ زیر نظر کتاب میں جو مضامین شامل کیے گئے ہیں، ان کے حوالے سے اسی گفتگو کو آگے بڑھانے کی اور یہ جاننے کی کوشش کی گئی ھے کہ اردو ادب میں مزاحمت اور احتجاج کے رویے کی نوعیت کیا رہی ہے۔"(۸)

"سلسلۂ روز و شب"، فکری، علامتی اور نفسیاتی امکانات کو ایک نئی سطح پر لے جانے والی تخلیق ہے، جو قاری کو صرف جمالیاتی لطف ہی نہیں دیتی بلکہ اسے فکری، روحانی اور لاشعوری سطح پر بھی جھنجھوڑتی ہے۔ یہ نظم نہ صرف وجودی کشمکش (existential conflict) کا اظہار ہے، بلکہ اس میں نفسیاتی ابہام(psychological ambiguity) ، لاشعوری اضطراب(unconscious anxiety) اور ہستی و نیستی (being and non-being) کے مابین ہونے والے مکالمے کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ میراجی نے اس نظم میں انسان کے باطنی بحران، زمان و مکان کی ادراکی حد بندی اور معنویت کے زوال کو ایک پیچیدہ اور تہہ دار شعری بیانیے میں ڈھالا ہے جو بیک وقت تخیلاتی(imaginative) ، علامتی(symbolic) اور فلسفیانہ (philosophical) ہے۔ نظم کا پہلا ٹکڑا ہے:

"خدا نے الاؤ جلایا ہوا ہے
اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے
ہر اک سمت اس کے خلا ہی خلا ہے"(۹)

"ہر اک سمت خلا ہی خلا ہے"؛ یہ مصرع نظم کا فکری اور وجودی محور ہے۔ یہ "خلا" صرف خارجی یا کائناتی نہیں بلکہ داخلی اور نفسیاتی بھی ہے، ایک ایسا خلا جو فرد کو اپنی معنویت کھو دینے کے بعد گھیر لیتا ہے۔ یہاں "خلا" محض فزیکل ویکیوم نہیں بلکہ ایک ذہنی و روحانی ویرانی ہے، جو وجودی بے یقینی (existential uncertainty) اور معنوی افلاس

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

(spiritual void) کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ کیفیت دراصل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب فرد اپنے آپ سے، اپنے وقت سے اور اپنی حقیقت سے بیگانہ ہو چکا ہوتا ہے۔ نظم کی فضا میں جو دھندلا پن، علامتی کثافت اور صوتی تکرار موجود ہے، وہ قاری کو بھی ایک ماورائی، خواب نما کیفیت میں لے جاتا ہے، جہاں معنی مستحکم نہیں بلکہ متغیر، منتشر اور الجھے ہوئے ہیں۔ نظم کا راوی نہ صرف "خدا"، "ازل"، "ابد" اور "عدم" جیسے بڑے تصورات سے الجھتا ہے، بلکہ اپنی ذات کے آئینے میں بھی شکست وریخت کا سامنا کرتا ہے، جیسا کہ وہ کہتا ہے: "حقیقت کا آئینہ ٹوٹا ہوا ہے"۔ یہ آئینہ دراصل وہ داخلی شفافیت ہے جو فرد کو خود آگہی عطا کرتی ہے، مگر جب یہ ٹوٹ جاتا ہے تو "میں" کی شناخت دھندلا جاتی ہے اور خارجی معنویت بھی شکست خوردہ ہو جاتی ہے۔

"سمٹتے ہوئے دل میں وہ سوچتا ہے
تعجب کہ نورِ ازل مٹ چکا ہے" (۱۰)

نظم کے وجودی اور لاشعوری تناظر میں ایک گہری علامتی معنویت کا حامل ہے، جو نفسیاتی تناؤ (psychic tension) اور وجودی اضطراب (existential anxiety) کا آئینہ ہے۔ یہاں "دل کا سمٹنا" کوئی سادہ جذباتی کیفیت نہیں بلکہ اندرونی انتشار (inward contraction) کا وہ لمحہ ہے جب شعور، لاشعور سے ٹکرا کر ایک ایسی کیفیت میں داخل ہوتا ہے جہاں ہر یقین متزلزل ہونے لگتا ہے۔ یہ عمل Freudian repression سے مشابہ ہے، جہاں شعور لاشعوری مواد کو دبا تو دیتا ہے، مگر وہ "سمٹنے" کی صورت میں ظاہر ہونے لگتا ہے۔ "تعجب کہ نور ازل مٹ چکا ہے" ایک فلسفیانہ انقطاع (metaphysical rupture) کو ظاہر کرتا ہے۔ "نورِ ازل" یہاں صرف مذہبی یا صوفیانہ سچائی نہیں، بلکہ ازلی معنویت (primordial meaning) کا استعارہ ہے؛ وہ وجودی "یقین" جس پر فرد اپنی زندگی کی معنویت استوار کرتا ہے۔ شاعر کا یہ کہنا کہ "نور ازل مٹ چکا ہے"، دراصل nihilistic disillusionment کا اظہار یہ ہے: ایک ایسا لمحہ جب زندگی کے ماورائی سہارے ختم ہو جاتے ہیں اور فرد کو اپنی معنوی خالی پن (existential void) کا سامنا ہوتا ہے۔ نظم کے موضوعی دائرے؛ وجود، لاشعور اور داخلی کشمکش؛ میں یہ بند بنیادی اور استعارہ انگیز مقام رکھتا ہے۔ نظم میں "نور ازل" کا مٹنا دراصل خارجی حقیقت کے بجائے داخلی معنویت کے انہدام کا اشارہ ہے، جہاں کائنات کا سارا تصور ایک وجودی سوال میں بدل جاتا ہے۔ یوں، یہ فقط ایک مشاہدہ نہیں بلکہ ایک جمالیاتی بحران (aesthetic crisis) اور فکری انقطاع کا بیانیہ ہے، جو نہ صرف نظم کی فضا کو مزید گہرائی عطا کرتا ہے بلکہ قاری کے فکری و روحانی اضطراب کو بھی بیدار کرتا ہے۔

"بہت دور انسان ٹھٹھکا ہوا ہے

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

اسے ایک شعلہ نظر آرہا ہے

مگر اس کے ہر سمت بھی اک خلا ہے"(۱۱)

یہاں "انسان" ایک علامتی کردار (symbolic figure) کے طور پر ظاہر ہوتا ہے، جو نہ صرف خارجی دنیا میں "دور" ہے، بلکہ باطنی سطح پر بھی الگ تھلگ اور اجنبی (existential alienation) کا شکار ہے۔ "ٹھٹھک جانا" ایک معمولی جسمانی عمل نہیں بلکہ وجودی ہچکچاہٹ (existential hesitation) کی وہ حالت ہے، جب فرد شعور اور لاشعور کے سنگم پر رُک کر اپنے وجود کے ابہام کا سامنا کرتا ہے۔ اس "ٹھٹھکنے" میں ادراکی تضاد (cognitive dissonance) بھی شامل ہے: انسان ایک سمت میں "شعلہ" یعنی امید، روشنائی، یا معنویت کی کسی جھلک کو دیکھتا ہے، جو Freudian نظریہ کے مطابق لاشعور میں دبی ہوئی کوئی خواہش یا یاد ہو سکتی ہے۔ یہ "شعلہ" در حقیقت arché-type of light یا روشنی کے ازلی استعارے کی صورت رکھتا ہے، جو صوفیانہ و مابعد الطبیعیاتی سیاق میں "ہدایت" یا "نکتۂ آغاز" بھی ہو سکتا ہے۔ تاہم، یہ روشنی مکمل تسلی نہیں دیتی، کیوں کہ وہ "خلا" سے گھری ہوئی ہے، جو کہ ایک شدید نفیاتی ماحول (negational atmosphere) کی علامت ہے۔ "ہر سمت خلا" کا تصور نظم کی بنیادی فضا یعنی نفی، بیگانگی اور وجودی خلاء (existential void) کو مزید واضح کرتا ہے۔ یہ مصرع cosmic absurdity اور nihilism کا مکمل اظہار ہے، جہاں نہ صرف فرد بلکہ اس کے تمام امکانات خلا میں تحلیل ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ یوں انسان اور کائنات کے درمیان ایک نافہم اور ناقابلِ عبور فاصلہ قائم ہو جاتا ہے:

"تخیل نے یوں اس کو دھوکا دیا ہے

ازل ایک پل میں ابد بن گیا ہے"(۱۲)

یہاں نظم کی وجودیاتی مرکزیت (existential core) کو نمایاں ہوتی ہے۔ "تخیل" یہاں محض شعری تخلیق یا تخیلاتی صلاحیت نہیں بلکہ ایک ادراکی قوت (cognitive faculty) ہے، جس کے ذریعے فرد اپنے اور کائنات کے بیچ معنویت کا پل تعمیر کرتا ہے۔ لیکن جب یہی تخیل "دھوکہ" دیتا ہے، تو یہ دراصل self-deception یا وجودی فریب (existential illusion) کی وہ کیفیت ہے، جس میں انسان کسی جھوٹی تسلی یا خیالی معنویت میں پناہ لیتا ہے۔ اس دھوکے کا نتیجہ ایک نفسیاتی زوال (psychic disintegration) کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جہاں فرد حقیقت اور خیال کی درمیانی سرحدیں کھو بیٹھتا ہے۔ "ازل ایک پل میں ابد بن گیا ہے" کا مصرع وقت کے ساتھ انسان کے تعلق پر ایک عمیق مابعد الطبیعیاتی سوال (metaphysical question) اٹھاتا ہے۔ ازل اور ابد؛ جو صدیوں سے وقت کے "آغاز" اور "انجام" کے استعارے ہیں؛ یہاں ایک لمحے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ یہ linear temporality کے انہدام کی

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

نشاندہی کرتا ہے، یعنی وقت اب ایک تسلسل نہیں بلکہ ایک وجودی لمحہ (existential moment) بن جاتا ہے، جسے Martin Heideggerاپنی کتاب Being and Time میں temporality of Dasein کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ ہیڈیگر کے مطابق:

"فرد ماضی، حال اور مستقبل میں بیک وقت موجود ہوتا ہے اور اس کی "ہستی" (Being) کا شعور وقت کے ایک نقطے میں مرتکز ہو جاتا ہے۔"(۱۳)

"ازل کا ابد بن جانا" اسی collapse of chronological time کا مظہر ہے؛ ایک ایسا شعوری دھچکا، جو فرد کو وقت کی غیر یقینی وسعت میں گم کر دیتا ہے۔ یہ صرف فلسفیانہ معانی کا حامل نہیں بلکہ شعری جمالیات کا بھی حامل ہے۔ "دھوکہ"، "ازل"، "پل"، "ابد"؛ یہ سب الفاظ نہ صرف علامتی کثافت رکھتے ہیں بلکہ ایک متوازی سطح پر فرد کی داخلی شکست، وقتی ادراک اور روحانی خلاء کو بھی ظاہر کرتے ہیں اور مجموعی بیانیے کو ایک ایسی سطح پر لے آتا ہے، جہاں وجودی الجھن، وقتی شکست اور تخیلاتی انحراف باہم مل کر ایک ایسی دنیا تشکیل دیتے ہیں جو نہ صرف معنویت سے خالی ہے بلکہ فریب اور اضطراب سے بھری ہوئی ہے۔

نظم کا پانچواں حصے میں ایک گہری وجودی مایوسی (existential despair) اور معرفت کے انہدام (epistemological breakdown) کی عکاسی کرتا ہے، جو نظم کی نفسیاتی و فلسفیانہ پرتوں کو مزید گہرائی عطا کرتا ہے:

"عدم اس تصور پہ جھنجھلا رہا ہے
نفس دو نفس کا بہانہ بنا ہے
حقیقت کا آئینہ ٹوٹا ہوا ہے"(۱۴)

یہاں "عدم" کو ایک فاعل (active) تصور کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو محض ایک مابعد الوجودی خلا (non-being) نہیں، بلکہ ایک شعوری قوت ہے جو ردعمل ظاہر کر رہی ہے۔ "جھنجھلا رہا ہے" کا استعمال اس بات کا اشارہ ہے کہ اب "عدم" خود فکری اضطراب (philosophical irritation) کا شکار ہو چکا ہے، گویا اس کے لیے بھی اب کچھ واضح یا مانوس نہیں رہا۔ یہ سطر post-existential crisis کی علامت ہے، جہاں وجود (being) کے سوالات اس قدر پیچیدہ اور مبہم ہو چکے ہیں کہ حتیٰ کہ "عدم" جیسا مطلق تصور بھی ان کی تاب نہیں لا سکتا۔ "نفس دو نفس کا بہانہ بنا ہے" ایک شدید وجودی تھکن (existential fatigue) کی عکاسی کرتا ہے۔ یہاں "نفس" یعنی زندگی یا سانس، اب ایک عارضی جواز (temporary pretext) بن چکی ہے؛ ایک ایسی سرگرمی جو نہ کسی حقیقی معنویت کی حامل ہے اور نہ کسی بلند تر مقصد کی غماز۔ یہ خیال Albert Camus کے "absurdism" سے جڑتا ہے، جس میں زندگی کا تسلسل محض ایک غیر

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

منطقیت (irrationality) کی بنیاد پر قائم رہتا ہے اور فرد اس "بے معنویت" (meaninglessness) کو قبول کر کے ہی آزادی حاصل کرتا ہے۔ "حقیقت کا آئینہ ٹوٹا ہوا ہے"؛ ایک انتہائی نازک معرفتی بحران (epistemological crisis) کو شعری علامت کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ "آئینہ" ہمیشہ سے حقیقت، سچائی اور خود شناسی کی علامت رہا ہے۔ اس کا "ٹوٹا ہوا" ہونا دراصل اس بات کی نشاندہی ہے کہ اب سچائی کوئی واحد، مطلق اور شفاف شے نہیں رہی، بلکہ وہ کثیر المعنی (pluralistic)، متنازع (contested) اور غیر شفاف (opaque) ہو چکی ہے۔ یہ تصور postmodern epistemology سے ہم آہنگ ہے، جہاں حقیقت کو ساختیاتی معروض (constructed object) سمجھا جاتا ہے، جو کبھی مکمل طور پر عیاں نہیں ہو سکتی۔ نظم کے سیاق میں، "فرد بمقابلہ کائنات" کے کشمکش کو شدت بخشتا ہے۔ فرد نہ صرف اپنی داخلی ہستی سے بیگانہ ہو چکا ہے بلکہ کائناتی سطح پر بھی وہ معنی کی تلاش میں ناکام ہو رہا ہے۔ یہاں "عدم"، "نفس" اور "آئینہ" تینوں ایسے مابعد الطبیعیاتی استعارے (metaphysical metaphors) ہیں جو وجود کی مختلف سطحوں پر جاری بحران کو علامتی سطح پر اجاگر کرتے ہیں۔ اس حصے کا مجموعی اثر قاری کو ایک فکری خلا (intellectual void) اور احساسی بیگانگی (emotional alienation) میں مبتلا کرتا ہے، جہاں نہ تو سچائی کا کوئی پائیدار چہرہ بچا ہے اور نہ ہی زندگی کے تسلسل کے پیچھے کوئی معقول جواز باقی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جہاں نظم ایک گہرے فکری مکاشفے (philosophical revelation) میں داخل ہوتی ہے اور قاری کو اپنی ہستی، وقت اور سچائی کے بنیادی سوالات پر از سرِ نو غور کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

نظم "سلسلۂ روز و شب" کا آخری بند اپنے فکری عمق، علامتی جہات اور وجودی تمثیل (existential metaphor) کے اعتبار سے پوری نظم کا خلاصہ اور نقطۂ عروج (climactic culmination) ہے:

"تو پھر کوئی کہہ دے یہ کیا ہے وہ کیا ہے
خلا ہی خلا ہے خلا ہی خلا ہے" (۱۵)

یہ ایک ایسی صدائے گم گشتہ معلوم ہوتی ہیں جو معنی کی تلاش میں ناتمام رہنے والے شعور کی بازگشت بن جاتی ہیں۔ پہلی سطر میں "تو پھر کوئی کہہ دے..." کا اندازِ تخاطب دراصل ایک مایوسانہ التجا (desperate appeal) ہے، جو اس امکان کو تلاش کرتی ہے کہ شاید کوئی اور فرد، کوئی اور شعور، اس ابہام کو واضح کر سکے جو نظم کے مرکزی راوی کو گھیرے ہوئے ہے۔ تاہم، اس فریاد میں بھی ایک طنز آمیز خلائی طنطنہ (Ironic Void) ہے، کیوں کہ نظم میں اس "کوئی" کی موجودگی خود ایک تصوراتی فریب سے زیادہ کچھ نہیں۔ "یہ کیا ہے، وہ کیا ہے" جیسے عام الفاظ دراصل معرفت کے بحران (crisis of knowing) کا اظہار ہیں۔ یہ سوالات اپنی سادگی میں ایک گہری پیچیدگی رکھتے ہیں؛ کیوں کہ یہاں

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

اصل سوال ''کیا'' نہیں، بلکہ ''کیا کوئی جانتا ہے'' ہے؟ اور یہی سوال نظم کے تمام بندوں میں زیرِ سطح موجود رہا ہے۔ یہ لمحہ سارتر (Sartre) کے "nausea" اور کافکا (Kafka) کے "trial-like absurdity" کی فضا سے متصل محسوس ہوتا ہے، جہاں فرد دنیا سے ایک سادہ سا مطلب اخذ کرنا چاہتا ہے، لیکن ہر جانب سے اسے محض ابہام، خاموشی اور خلا ملتا ہے۔

''خلا ہی خلا ہے، خلا ہی خلا ہے''، ایک وجودی تکرار (existential repetition) ہے جو نظم کے اختتام کو نہ صرف شاعرانہ بلکہ فلسفیانہ سطح پر بھی مہر بند کرتی ہے۔ یہاں ''خلا'' صرف فزیکل یا زمانی خالی پن کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک معنوی، نفسیاتی اور مابعد الطبیعیاتی خلا (Ontological Void) ہے؛ ایک ایسی کیفیت جس میں نہ مرکز ہے، نہ سمت، نہ منزل۔ یہاں، البرٹ کیموس کی "Absurdity of Existence" کی عکاسی کرتا ہے، جہاں زندگی کا سارا تجربہ ایک ایسی دنیا میں ہوتا ہے جو کسی حتمی مقصد، اخلاقی مرکز، یا الٰہی معنویت سے خالی ہے۔ یہاں ''خلا'' خود ایک استعارہ بن جاتا ہے: ایک ایسا غیر مرئی افق جو ہر احساس، ہر خیال اور ہر شناخت کو جذب کر لیتا ہے۔ فنی اعتبار سے یہ اختتام علامتی گونج (symbolic resonance) پیدا کرتا ہے۔ ''خلا ہی خلا ہے'' کی تکرار نہ صرف لسانی موسیقیت (linguistic rhythm) فراہم کرتی ہے بلکہ قاری کے ذہن میں ایک فکری گونج (intellectual echo) چھوڑ جاتی ہے؛ گویا نظم ختم نہیں ہوتی، بلکہ ایک وسیع تر خلا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ قاری نظم کے اختتام پر نہ کسی نتیجے پر پہنچتا ہے، نہ کسی وضاحت پر، بلکہ ایک ایسی ساکن مگر متحرک کیفیت (static yet dynamic condition) میں چھوڑ دیا جاتا ہے جو جدید وجودی ادب کی خاص پہچان ہے۔ یہ نظم کی فکری و جمالیاتی تکمیل ہے اور اس کا خلا؛ بظاہر عدم کا مظہر؛ در حقیقت وجود کی شدید ترین صدا ہے، جو خاموشی میں لپٹی ہوئی ہے۔

مجموعی طور پر نظم ''سلسلۂ روز و شب'' ایک فکری، روحانی اور نفسیاتی جہات کی آمیزش ہے، جو اردو نظم میں وجودی فکر (existential thought)، لاشعور (unconscious) اور داخلی کشمکش (inner conflict) کو ایک گہری علامتی اور جمالیاتی سطح پر بیان کرتی ہے۔ یہ نظم محض لفظوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک ایسا شعری کائنات ہے جس میں وقت، ہستی، نیستی، خیال اور حقیقت سب ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر ایک بے نام کرب اور سوال کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ نظم کا ہر بند قاری کو ایک نئی سطح پر لے جاتا ہے، جہاں ''خلا''، ''نورِ ازل''، ''شعلہ'' اور ''آئینہ'' جیسے استعارے فرد کی اس اندرونی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں جو اپنی معنویت کی تلاش میں مسلسل بھٹک رہا ہے۔ میراجی کی اس نظم میں Freudian لاشعور کی دھند بھی جھلکتی ہے اور Heideggerian فکر کی معنویتِ ہستی (meaning of being) بھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظم نہ صرف نفسیاتی و فلسفیانہ مباحث کو ایک تخلیقی پیرائے میں بیان کرتی ہے بلکہ اردو نظم کو ایک

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

جدید فکری کینوس عطا کرتی ہے۔ نظم کا اختتام؛ "خلا ہی خلا ہے"؛ دراصل ایک ایسا شعری لمحہ ہے جو وجودی ادب کی روح کو مجسم کرتا ہے، جہاں فرد اپنے سوالات میں تنہا ہے اور کائنات کی خاموشی ہی اس کا واحد مکالمہ ہے۔ یوں "سلسلۂ روز و شب" اردو نظم نگاری میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ یہ نظم ہمیں فرد اور کائنات کے اس باہمی تناؤ کا احساس دلاتی ہے جو ہمیشہ سے ادب، فلسفہ اور نفسیات کا مرکزی موضوع رہا ہے۔ میراجی کی یہ تخلیق اس بات کا ثبوت ہے کہ نظم نہ صرف احساس کا اظہار ہے، بلکہ ایک فکری جستجو بھی ہے؛ ایک ایسی جستجو جو کبھی ختم نہیں ہوتی، بس شکلیں بدلتی رہتی ہے۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کی کروٹیں، نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۰ء، ص:۱۱

۲۔ کوثر مظہری، جدید نظم: حالی سے میراجی تک، نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۸ء، ص:۱۱

۳۔ کیرکیگارڈ، ایس، The Concept of Anxiety، پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۰ء، ص:۳۰۴

۴۔ نطشے، فریڈرک، Thus Spoke Zarathustra، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۶ء، ص:۳۱۲

۵۔ سارترے، جے پی، Existentialism is a humanism، ییل یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۷ء، ص:۱۷

۶۔ میراجی، کلیاتِ راشد، دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۱۱ء، ص:۲۰۳

۷۔ فلن، ٹی آر، Existentialism: A Very Short Introduction، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۶ء، ص:۱۱۲

۸۔ ارتضیٰ کریم، اردو ادب احتجاج اور مزاحمت کے رویے، دہلی: اردو اکادمی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۱

۹۔ میراجی، کلیات راشد، ص:۲۰۳

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ہائیڈیگر، ایم، Being and Time، ہارپر اینڈ رو، ۱۹۹۷ء، ص:۳۵۲

۱۴۔ میراجی، کلیات راشد، ص:۲۰۳

۱۵۔ ایضاً